بحث و نظر

جماعتِ اسلامی اور سیاساتِ پاکستان

۱ــ جناب جاوید انصاری صاحب مدیر معاون یونیورسل میسیج ۔ کراچی

۲ــ جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عریبیا ۔ لندن ۔

۳ــ مدیر ترجمان القرآن ۔

ماہنامہ عریبیا کے تازہ شمارے (ماہ ربیع الاوّل ۱۴۰۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۸۵ء) میں جناب جاوید انصاری نے جماعت اسلامی کی ایک حامیانہ تصویر پیش کی ہے ۔ اس پر جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عریبیا نے بطورِ خاص تبصرہ کیا ہے ۔ جماعت کو انقلابیت سے ہٹ کر " دعوۃ " کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے ۔ اس سلسلے میں مدیر ترجمان القرآن نے بھی محسوس کیا کہ کچھ کہنا ضروری ہے ۔ مجھے اپنی رائے مرتب کر کے مرتب کر کے براہ راست "عریبیا" کو بھجوانی ہے ، مگر اس وقت اس کا ترجمان القرآن میں آنا ضروری ہے ۔

میری سہولت کے لیے جناب پروفیسر آسی ضیائی رام پوری اور برادر عزیز عبد الہادی احمد دونوں نے متذکرہ مضامین کے اُردو تراجم فراہم کر دیے تاکہ رسالے کی تیاری میں تاخیر نہ ہو ۔ اُمید ہے کہ یہ تحریریں قارئین کے لیے دلچسپ ہی نہیں ، بہت مفید بھی ہوں گی ۔

(خ ۔ ص)

(۱)

جناب جاوید انصاری مدیر معاون "میسیج" کراچی

گذشتہ برسوں میں جماعتِ اسلامی پاکستان ، تنقید و تذلیل کی کئی مہموں کا موضوع رہی ہے ۔

اس مضمون کا مقصد ان نکتہ چینیوں کا جائزہ لینا اور ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۵ء تک کے کٹھن دور میں جماعت کی پالیسیوں کا معقول اور متوازن دفاع کرنا ہے۔

مسٹر بھٹو نے جس جمہوریت کو چلتا کر دیا تھا اس کی بحالی کے لیے تحریک میں جماعت پیش پیش تھی۔ مگر اس تحریک میں شامل چند بے صبر عناصر جلد ہی الگ ہو گئے اور فوج کو پاکستان کی قومی سیاسی زندگی پر قبضہ مستحکم کر لینے دیا گیا۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں تحریک میں شامل جماعتوں نے بالعموم فوج سے مفاہمانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ نئی فوجی انتظامیہ نے وہ خطیبانہ سیاسی نعرہ اپنایا جو بہت دلکش تھا۔ جنرل ضیاء نے پاکستان میں اسلامی سیاسی نظام قائم کرنے کا وعدہ کیا۔ انھوں نے علامتی اصلاحات اور معاشی پالیسیاں نافذ کیں، جن کا مثبت اثر ہوا، اور انھوں نے جلد ہی نمائندہ حکومت بحال کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

اگست ۱۹۷۸ء میں جو سول انتظامیہ قائم کی گئی اس میں دو مقاصد کے پیش نظر جماعت بھی شامل ہو گئی۔ اولاً وہ اس طریق پر حاوی ہو جانا چاہتی تھی جو پارلیمانی جمہوریت کی بحالی پر منتج ہو۔ ثانیاً وہ ایسی قومی پالیسی اور اصلاحات بروئے کار لانا چاہتی تھی جو پاکستان میں اسلامی نظام معاشرت تعمیر کرنے کی راہ ہموار کر سکیں۔ نو ماہ کا وہ عرصہ جب جماعت حکومت میں شامل تھی، نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔ ہم میں سے جو صاحبان وزارتوں میں آئے وہ جنرل ضیاء اور اس کے فوجی حلیفوں کے اصل عزائم سے باخبر ہو گئے۔ یہ واضح ہو گیا کہ فوجی حکومت معاشرے کو اسلامی بنانے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس کا تو مقصد اسلام کو اسی طرح استعمال کرنا تھا جیسے بھٹو سوشلزم کو اور فیلڈ مارشل ایوب خان قومیت کو استعمال کر رہے تھے۔ یوں اسلامی بنانا محض معاشرے کو سیاست سے الگ رکھنے اور فوجی آمریت کو دوام بخشنے کا ایک ذریعہ تھا۔ جماعت کی وزارتوں نے ۱۹۷۸ء سے ۱۹۷۹ء تک کے عرصے میں جو پالیسیاں تجویز کیں ان کی بڑی اکثریت کو صدر اور اس کے مشیروں نے مسترد کر دیا۔

۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۵ء تک جماعت فوجی انتظامیہ کی پالیسیوں کی کڑی مخالف رہی۔ ان پالیسیوں میں کھلے تضادات سے جماعت کی قیادت کو تشویش تھی تاہم بعض رفقاء کی دلیل یہ تھی کہ صدر خود تو ایک مخلص مسلمان ہے مگر سول انتظامیہ اس کی پالیسیوں کو ناکام بنائے دے رہی ہے۔ اس طرح ضرورت تھی کہ جس اسلامی نظم کی نمائندگی کا صدر کو دعویٰ تھا اس کی تائید کی جائے اور ان پالیسیوں کے نفاذ کے لیے ایسے ادارے اور

طریقے وضع کیے جائیں جو نوکرشاہی کو قابو میں رکھیں۔

ارکانِ جماعت کی بھاری اکثریت نے اِس حکمتِ عملی کی توثیق کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدر ضیاء کو اس سال قومی استصواب میں جماعت کی حمایت حاصل رہی۔ اس استصواب سے حکومت کے "اسلامیانے" کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی توثیق مطلوب تھی۔ مگر استصواب سے کچھ ہی قبل جنرل ضیاء نے ایک ٹیلی وژن نشریے میں کہا کہ اس توثیق کا مطلب وہ یہ لیں گے کہ انہیں مزید پانچ سال تک پاکستان کے صدر بنے رہنے کا پروانہ مل گیا۔ جماعت جنرل ضیاء کی حمایت پر رضامند ہوگئی، کیونکہ امیر جماعت میاں طفیل محمد سے ایک ملاقات میں صدر نے وعدہ کیا کہ وہ شریعت کو ملک کا بالادست قانون بنائیں گے، ۱۹۷۳ء کا دستور تمام و کمال بحال کر دیں گے اور غیر مشروط طور پر مارشل لا اُٹھا لیں گے۔

جماعت کے جو رہنما ۱۹۷۸ء تا ۱۹۷۹ء سول انتظامیہ میں وزیر رہ چکے تھے انھیں صدر کی وعدہ خلافی پر کوئی تعجب نہ ہوا۔ وہ چھ سال پہلے ہی جان گئے تھے کہ فوجی قیادت، افسر شاہی کے اختیارات گھٹانے یا عوامی نمائندگی کے لیے اسباب پیدا کرنے کا، جس سے افسروں کو قابو میں رکھا جا سکے، کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ ان رہنماؤں کا کہنا تھا کہ جماعت حکومت کی نافذ کردہ "نفاذِ اسلام کی اسکیم" کا پول کھول دے اور عوام کو بتا دیا جائے کہ یہ محض پاکستان پر فوجی آمریت جاری رکھنے کا ایک پردہ ہے۔

وسط ۱۹۸۵ء میں جماعت نے فیصلہ کیا کہ قومی اور تمام صوبائی اسمبلیوں میں حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرے، نیز اس نے اس کے لیے بھی مساعی تیز کر دیں کہ ایک وسیع بنیاد سیاسی پروگرام پر مبنی قومی اتحاد قائم کرے۔ اس پروگرام کے کلیدی عناصر یہ ہیں:

— ۱۹۷۳ء کے دستور کی تمام و کمال بحالی اور پاکستان میں اسلامی جمہوریت کا قیام۔
— پاکستان کی قومی سالمیت کا تحفظ اور ۱۹۷۳ء کے دستور کے عطا کردہ چھوٹے صوبوں کے حقوق کی بحالی۔
— جہاد افغانستان کی حمایت جاری رکھنا۔

جماعت کو فوجی حکومت سے تعاون پر بھی ہدفِ نکتہ چینی بنایا گیا ہے اور اس کی مخالفت کے لیے ایک قومی سیاسی اتحاد قائم کرنے کی کوشش پر بھی۔ میرا یہ منشا نہیں کہ ان میں سے کسی حکمتِ عملی کا دفاع کروں۔ میں جس نکتے پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامی اقدار اور اسلامی نظریۂ سیاسی کے تناظر میں یہ دونوں حکمتیں بالکل جائز ہیں۔ کسی ایک سیاسی تدبیر کا انتخاب سیاسی طور پر مہنگا، بلکہ شاید بہت ہی مہنگا

پڑ سکتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کہ بطور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے، جماعت اسلامی کے لیے یہ جائز نہیں۔

ایک اسلامی انقلابی پارٹی ہوتے ہوئے جماعت سے وقتاً فوقتاً سیاسی غلطیاں بھی ہو سکتی ہیں جماعت نے اپنے ارکان اور کارکنوں کی اخلاقی و روحانی تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ کچھ کارکنوں میں دنیا کی طرف میلان پیدا ہو چلا ہے اور اسلامی کام سے اُن کا رویہ پیشہ ورانہ سا بن گیا ہے۔ اس کا نتیجہ پارٹی ڈسپلن ڈھیلا پڑ جانے اور پاکستانی معاشرے پر جماعت کے کام کا اخلاقی اثر ہلکا ہو جانے کی صورت میں رُونما ہوا ہے۔

۱۹۵۷ء کی تحریک میں جو فوائد حاصل ہوئے تھے، جماعت انہیں اختیار کرنے INSTITUTION-ALISING میں کامیاب نہ ہو سکی۔ مزید برآں، انتخابی سیاست پر زیادہ توجہ دینے کے باعث سماجی اور تعلیمی کام، جو جماعت نے اپنے ذمے لے رکھے تھے، اُن کی طرف سے بھی بے اعتنائی برتی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کے شہروں اور قصبوں میں عوامی بنیاد قائم کر لینے کے بہت سے مواقع جماعت نے کھو دیے۔ سب سے بڑھ کر یہ امر نقصان دہ ہوا کہ انقلابی نظریے کے فروغ کی طرف ناکافی توجہ دی گئی۔ بہت سے پالیسی اقدامات بیرونی محرکات کے فوری (ADHOC) تقاضوں کے تحت عمل میں آئے۔

جماعت کو شدید خطرے کا سامنا ہے کہ اس کی نگاہوں سے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے عمل کا مربوط منظر اوجھل نہ ہو جائے اور وہ اس عمل کو دوسروں کے سامنے آشکارا کرنے کی صلاحیت کے لحاظ سے کوتاہ ثابت ہو۔ اگر ایسا ہو گیا تو پھر عملیت اور تجربیت ہی پارٹی کے بنیادی اصول بن کر رہ جائیں گے۔

جماعت کو جو ناکامیاں ہوئیں اُن کی وجہ سے کتنے ہی رفقاء کو مایوسی ہوئی اور کچھ جماعت سے نکل بھی گئے، مگر انہیں پاکستان کی لادینی قوتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل کوئی اور پلیٹ فارم تیار کرنے میں ناکامی ہوئی، بلکہ اکثر نے تو یہ کوشش ہی نہیں کی۔ جماعت اسلامی ہی ملک میں وہ تنہا سیاسی اور سماجی قوت ہے جو پاکستان میں ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے پائیدار تحریک چلانے کی اہل ہے۔ یہ اس لیے کہ مولانا مودودیؒ کا پیش کردہ انقلابی نظریہ قطعی درست ہے اور آج کی مسلم دنیا میں نظریاتی اور

سماجی حالات میں انتہائی موزوں بیٹھتا ہے۔ اس کا خلاصہ ذیل کے قضیوں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔

— نوآبادیاتی استعمار کے تحت مسلم معاشروں میں باقاعدہ طبقہ بندی (FUNCTIONAL DISJUNCTURE) نمایاں ہے جو حکمران گروہ کی سماجی علیحدگی پسندی میں نظر آتا ہے، اور یہ طبقہ اصلاً بیرونی استعمار کی حمایت کے بل پر سیاسی اقتدار پر قابض ہے۔

— ان معاشروں کے اسلامی کردار کی بحالی کا تقاضا ہے کہ ان زبردستی کے سیاسی دھرماتماؤں کو بے دخل اور منتشر کر دیا جائے اور منظم مسلم طاقتوں کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار مستحکم کر دیا جائے۔

— مسلم ممالک میں اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے کا واحد پائیدار آلہ ایک اسلامی انقلابی جماعت ہی ہو سکتی ہے۔ ایسی پارٹیاں اپنے سماجی اثرات کو سیاسی اقتدار میں بدل دینے ہی سے غرض رکھیں نہ کہ جزئی اصلاحات سے۔

یہ امر کہ جماعتِ اسلامی ایک اسلامی انقلابی پارٹی ہے، دو باتوں سے ظاہر ہے۔ قیامِ پاکستان ہی سے یہ جماعت پاکستانی سیاست میں فعال رہی ہے۔ وہ جزئی اصلاحات پر کبھی مطمئن نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنی تمام سرگرمیاں پاکستان میں اسلامی اصولِ سیاست و مدنیت کی تعمیر کے بنیادی کام میں صرف کرتی رہی ہے — ۴۸ء میں، ۶۲ء میں، ۷۱ء میں اور ۷۷ء میں پاکستان کا اسلامی تشخص منوانے اور جمہوریت بحال کرانے والی تمام قومی تحریکوں میں مرکزی کردار جماعت ہی کا رہا ہے۔ ۸۲ء سے ایم۔ آر۔ ڈی کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کی کوئی قومی تحریک، جماعت کی فعال شرکت کے بغیر نہیں چل سکتی۔ آج جماعتِ اسلامی ہی پاکستان کی وہ واحد قومی جماعت ہے جو ایسی کوئی قومی تحریک منظم کر سکتی ہے جو عزم و فداکاری کی عملی طاقت بھی رکھتی ہے اور ایسی قیادت بھی جو ملک کے قومی اور اسلامی مفادات کو ذاتی مفاد پر فوقیت دینے کی اہل ہے۔

قربانیاں دینے کی اعلیٰ صلاحیت رکھنا جماعت کی قیادت کا ہمیشہ سے نمایاں وصف رہا ہے۔ قیادت کے اندر پالیسی کے مسائل پر اختلافات نے جماعت کو ہمیشہ تقویت ہی بخشی ہے۔ گذشتہ سالوں میں میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور کے مابین پالیسی تناظروں میں اختلافات پر بہت سے ہمدردوں کو تشویش ہوئی بعض مخالفین نے اس پر خوش ہو کر جماعت کی یقینی شکست و ریخت کی پیش گوئیاں بھی کیں۔ مگر جماعت کے اندر ان میں سے کسی رہنما نے بھی مایوسی ظاہر نہ کی۔ میاں طفیل محمد ایک نہایت محبوب امیر ہیں۔ جنہوں نے

ارکان کے لیے بلند اخلاق کا نمونہ قائم کیا ہے اور پروفیسر غفور کی سیاسی بصیرت کا بھی وسیع احترام کیا جاتا ہے۔ اور جماعت کا سیاسی کردار دوبالا کرنے میں اُن کا کام نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جماعت ہمیشہ جمہوری تنظیم پر کام کرتی آئی ہے۔ اور جب تک انفرادی قربانیاں اور اللہ کی رضا کے لیے کام کرتے رہنے کا عزم باقی رہے گا، سیاسی تناظروں میں اختلافات جماعت کی تقویت ہی کا باعث بنتے رہیں گے۔ یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ ان سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ جماعتی قیادت اختلافی سیاسی پسند و ناپسند سے باخبر ہے اور اپنی قومی حکمتِ عملی میں لچک کا عنصر شامل کر لینے کی اہل بھی ہے۔

پاکستان کے علمبردارانِ اسلام کو جماعت کے قریب تر آنا چاہیے۔ پاکستان کی قومی سالمیت برقرار رکھنے اور اس کا اسلامی کردار منوانے کے لیے یہ ایک اہم قوت کی نمائندگی کرتی ہے۔ ماضی میں اس نے سیاسی غلطیاں بھی کی ہوں گی، مگر بطور ایک اسلامی انقلابی جماعت کے، یہ تعمیری تنقید کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور ماحول کے تغیرات سے ہم آہنگ ہو جانے کی اہلیت کا ثبوت بھی دے چکی ہے۔ پاکستان کو اسلامی انقلابی خطوط پر چلا کر بدل ڈالنے کا اس کے سوا اور کوئی سیاسی ادارہ موجود نہیں ہے۔ جماعت پاکستان کا مستقبل بنانے میں اہم کردار ادا کیا چاہتی ہے۔ پاکستان کے اسلامی انقلابیوں کا، جو اس جماعت کی حمایت کرکے اور اس کی قیادت کے گرد جمع ہو کر بے یار و مددگار رہ جانے سے بچ سکتے ہیں، یہی قدرتی ملجا و ماویٰ ہے۔ (ترجمہ: پروفیسر آسی ضیائی، رام پوری)

---

(۲)

جناب فتحی عثمان چیف ایڈیٹر عریبیا، لندن

یہاں میں اپنی اس تحریر کی یاد تازہ کر رہا ہوں جو میں نے ڈاکٹر جاوید کے خط (عریبیا جون ۱۹۸۵ء) پر لکھی تھی۔ میں اب بھی اس یقین پر قائم ہوں کہ مسلم انقلابی (REVOLUTIONARY ISLAMIST) یا اسلامی انقلابی (ISLAMIC REVOLUTIONARY) کی اصطلاح ان لوگوں کو نہیں سجتی جو اسلام کے پیغام کو جامعیت اور اس کی امتیازی شان کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اسلام کا دارومدار پیغامِ الٰہی کی حیثیت سے دعوت پر ہے اور اس کے مخاطب تمام لوگ ہیں، ظالم بھی اور مظلوم بھی۔

وہ ان کے دلوں اور دماغوں کو روشن اور ہر روز دلائل اور مؤثر کردار کے ذریعے خدا کی طرف موڑنا چاہتا ہے:

"اے نبیؐ! اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو" (النحل-۱۲۵)

یہاں تک کہ خدا کے رسول موسیٰ اور ہارون علیہما السلام جو ایک جابر حکمران فرعون کی طرف بھیجے گئے، انہیں بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اسے خدا کا پیغام جس قدر ممکن ہو قابل قبول طریقے سے پہنچائیں۔

"جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرلے یا ڈر جائے" (طٰہٰ - ۴۳-۴۴)

ایمان والوں کو تو اپنا اور اپنے عقیدے کا دفاع کرنا ہی ہے جبکہ اربابِ اقتدار بھی ہمیشہ ان کو دبانے اور ان کے پیغام کو خاموش کرنے کے لئے قوت کا استعمال کرتے ہیں۔ میرے نزدیک تصادم کی پالیسی سے اسلام کے حق میں بہتر نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ کسی بھی گروہ کو اس وقت تک دشمن تصور کرنا درست نہیں ہوتا جب تک دشمنی ایک ٹھوس حقیقت نہ بن جائے۔ مختلف گروہوں کے متضاد مفادات کا حل بنیادی طور پر ایک خدا پر یقین رکھنے میں ہے۔ اس نوع کے باہمی نزاعات کو حل کرنے کے لئے خدائی تعلیمات و قوانین کی مکمل اطاعت ضروری ہے۔ اگر کوئی صاحبِ ثروت شخص آسائش زندگی کے میسر سامان اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے تو اسے محض اس بات پر اسلام کا انکار کرنے والا تصور نہیں کر لینا چاہیئے، کیونکہ خدائی پیغام کے اوصاف اور بنی آدم کو خدا کے عطا کردہ روحانی اور علم و دانش پر مبنی کمالات بسا اوقات انقلاب آفرین اور بنیادی تبدیلی کے سبب بن جاتے ہیں۔ دعوت کی حکمتِ عملی میں اہلِ ایمان کو جمع کرنا اور منظم کرنا زیادہ اہم اور فائق ہے۔

"اور اس شخص سے اچھی بات اور کس کی ہو گی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں مسلمان ہوں اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں، تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت

پڑی ہوئی تھی، وہ جگری دوست بن گیا ہے۔ یہ صفت نصیب نہیں ہوتی مگر ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگر ان لوگوں کو جو بڑے نصیبے والے ہیں۔" (حٰم السجدہ ۳۵-۳۴)

"اے نبی، برائی کو اس طریقہ سے دفع کرو جو بہترین ہو۔ جو کچھ باتیں وہ تم پر بناتے ہیں وہ ہمیں خوب معلوم ہیں۔" (المومنون - ۹۶)

یہ عین ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کے کچھ لوگ معاشرے کی اساسی تبدیلی کا اسلامی تعلیمات پر مبنی تصور مؤثر، واضح، قابل عمل اور موزوں انداز میں پیش کرنے سے قاصر رہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس انقلاب کی وہ ترغیب دلاتے اور تبلیغ کرتے ہوں وہ بانجھ اور بنجر نکلے، اس اندازِ فکر و عمل کی بناء پر عوام اس کے فوائد سے محروم رہتے ہیں۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اسلام کے لئے، جو تمام بنی نوع انسان کے لئے خدا کا پیغام ہے "مستقل انقلاب" کا نعرہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اسلامی تحریک کے لئے موزوں تر لقب "مستقل دعوت" ہے۔ وہ جو معاشرے کی اساسی تبدیلی کے اسلامی پیغام کو پیش کرتی اور اس کی اشاعت کرتی ہے۔ اس کی تشکیل متعدد عوامل سے ہوتی ہے۔ عقل اور اخلاق، انصاف اور امن کی تمام جہتوں میں ــــ روحانی اور مادی، سماجی اور سیاسی، داخلی اور بین الاقوامی ہر شعبے میں۔

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔" (آل عمران - ۱۰۴)

"اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہلِ کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا (آل عمران - ۱۱۰)

کسی بھی نوع کی نزاعی صورتحال میں عقلی استدلال اور پرامن حل کو ترجیح حاصل ہونی چاہیئے قوت کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب دلیل آزمالی گئی ہو اور ناکام ہو چکی ہو

اور کوئی مخالف قوت مسلسل جارحیت پر تلی ہو۔

"اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔"

(الحجرات - ۱۰ - ۹)

اب جماعت اسلامی چاہے تو ڈاکٹر جاوید کی اپنے بارے میں "ایک انقلابی جماعت" ہونے کی رائے کو قبول کرے یا رد کر دے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی اردو تحریروں میں جو لفظ "انقلاب" استعمال کیا ہے اور جو عربی تراجم میں بھی موجود ہے، معاشرے میں اساسی تغیر پیدا کرنے والے اسباب کی طرف نہیں بلکہ خود اس "بنیادی تغیر" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ پیغامِ الٰہی کی حیثیت سے اسلام کا یہ وصف ہے کہ یہ مطلوبہ تبدیلی کو انسان کی باطنی آمادگی (CONVICTION) پر تعمیر کرتا ہے اور یہ طاقتور اور کمزور کو یکساں طور پہ مخاطب کرتا ہے اس لئے کہ یہ ہر بنی آدم کے دل و دماغ کو مخاطب کرتا ہے۔ معاشرے میں بنیادی تغیر، ایسے تغیر کی دعوت دینے والی تحریک میں جمہور کی شرکت اور ان کی مادی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل کو صرف انقلابی کے "لیبل" تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔

ہر اسلامی تحریک کو ان مقاصد تک پہنچنے کے لئے ایسا منصوبہ بنانا چاہیئے جس میں موجودہ ماحول اور زمان و مکان کے عملی تقاضوں کا خیال رکھا جائے۔ یہ اہتمام بھی کر لیا جائے کہ یہ اسلامی تعلیمات کی رہنمائی میں ہو۔ مارکسی نقطۂ نظر سے جو چیز انقلابی معیار کے طور پہ متعارف کی جاتی ہے ممکن ہے اسے عملیت (PRAGMATISM) تجربیت (EMPIRICISM) یا اصلاح کاری (REFORMISM) کہہ کر مسترد کر دے یہ بات، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے یہ لازماً کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں ہے۔ مفکرین اسلام کی یہ نہایت سنجیدہ ذمہ داری ہے کہ وہ سماجی تبدیلی کے سلسلے

میں اسلامی تحریک کو رہنمائی فراہم کریں، نہ کہ یہ میدان مارکسی نظریے کی اجارہ داری کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ فکری خلفشار سے حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے۔

تاہم جماعت اسلامی معاصر اسلامی تحریک کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ "عریبیا" ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جس سے تحریک اور فکر کے میدانوں میں مختلف اسلامی مکاتیبِ فکر کو اظہار خیال کا موقع مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اگر جماعت اسلامی اس سلسلے میں اپنا مؤقف بیان کرنا ضروری سمجھے تو اس مساعدت کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

---

(۳)

مدیر ترجمان القرآن، لاہور

میں تہ دل سے جناب جاوید انصاری اور جناب فتحی عثمان کا شکر گزار ہوں کہ دونوں حضرات نے جماعتِ اسلامی کے متعلق جو کچھ کہنا ضروری سمجھا، نیک نیتی اور خیر خواہی سے کہا۔ اسی بنا پر میرے اندر کوئی تنقیدی ردِّ عمل پیدا نہیں ہوا بلکہ استفادہ کا جذبہ غالب رہا۔ رہے کچھ اختلافی پہلو، تو وہ لکھنے یا سوچنے والوں میں کہاں نہیں ہوتے۔

جناب فتحی عثمان کا وہ شاندار مقالہ بھی میرے سامنے ہے جو "قیادت و خدماتِ مودودیؒ" کے عنوان سے عریبیا دسمبر ۱۹۸۴ء (ربیع الاول ۱۴۰۵ھ) میں شائع ہوا۔ میں اُن کی صلاحیتوں ہی کا نہیں ان کی محنت و کاوش کا بھی معترف ہوں۔

دونوں حضرات کی تحریروں (عریبیا دسمبر ۱۹۸۵ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۶ھ) کے متعلق بعض نکات بطور وضاحت عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ جماعتِ اسلامی پاکستان گذشتہ چند برسوں میں جہاں کچھ حلقوں کی طرف سے تنقید و تحقیر کا نشانہ بنائی گئی، وہاں ملک کے سنجیدہ مزاج خواص اور نیک نہاد عوام نے اُسے اس لحاظ سے تحسین کی نگاہ سے دیکھا کہ دین اور ملک کو خطرات سے بچانے اور بحالیٔ جمہوریت کے لیے فضا کو سازگار بنانے کے لیے اُس نے نہایت درجہ محتاط اور متوازن پالیسی اختیار کی اور تصادم کے محرکات کے موجود ہونے کے باوجود تخریبی عناصر کا چند قدم بھی ساتھ نہیں دیا۔ جو لوگ اسے تصادم کی راہ پر گھسیٹ لے جانا

چاہتے تھے ، انہی نے زچ ہو کر اسے مارشل لا کی بی ٹیم قرار دیا اور یہ بات بار بار اچھالی ، مگر جماعت طنز و تعریض کی اس بوچھاڑ کے باوجود اپنے سوچے سمجھے موقف پر مضبوطی سے قائم رہی - آج بحالی جمہوریت کی راہ میں اڑنگا لگانے والے عناصر ہٹ گئے ہیں اور دعوتِ حق کے لیے کام کرنے کے راستے کھل رہے ہیں -

۲- جماعت کے لیے حکومت میں شمولیت کی تین سہ ماہیاں اس لحاظ سے مایوس کن یقیناً ثابت ہوئیں کہ جس مقدار و معیار کا کام کرنا مطلوب تھا وہ نہ ہو سکا - مگر دوسری طرف بہت سے دائروں میں بھی تبدیلیاں خاص اس دور میں تیزی سے شروع ہوئیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابلِ قدر تھیں -

۳- مارشل لا یا جنرل ضیاء کے متعلق جماعت سے جن دو اختلافی آرا اور ان کے ردعمل کو انصاری صاحب نے منسوب کیا ہے - ان کی کوئی جماعتی اہمیت مجلس شوریٰ کا دستوری فیصلہ ہو جانے کے بعد نہیں رہتی - ہمارے ہاں کوئی ایسی مسلمہ روایت نہیں ہے کہ کسی اہم مبحث کے متعلق جماعتی فیصلے سے پہلے یا بعد میں اس کے افراد جماعت کے متعین کردہ دستوری دائرے سے باہر اپنی متفرق آرا کو الگ الگ کر کے پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعے پھیلائیں - اگر ایسی کوئی لغزش کسی سے صادر ہو بھی جائے تو وہ لغزش جماعت کی خوبیوں یا خرابیوں میں محسوب نہیں ہو سکتی -

۴- صدر کی جس وعدہ خلافی کا ذکر انصاری صاحب نے کیا ، اس کے خلاف بالاختصاص سابق وزرا ہی کا نہیں ، مرکزی قیادت سے لے کر عام کارکنان تک کسی نہ کسی رنگ کا ردِ عمل موجود تھا - مگر جماعت کے مجموعی ذہن نے اس تکلیف دہ پوائنٹ پر " حکومت کے نفاذِ اسلام کی اسکیم کا پول کھول دینے " کی کسی بڑی مہم میں لگ جانے کے بجائے زیادہ بہتر یہ سمجھا کہ بھرپور کوشش اس بات کے لیے ہونی چاہیے کہ فوجی آمریت کی تلوار سروں سے ہٹے اور جمہوری راستے کھلیں - اور ملک کے ہنگامہ پسند اور تخریبی عناصر کے پلڑے میں اپنی اجتماعی روش کا وزن ڈال کر ایسے حالات پیدا نہ کر دیئے جائیں کہ مارشل لا طول کھینچے یا وہ فقط اپنا چہرہ تبدیل کر کے رہ جائے -

البتہ فوجی آمریت کے منصوبۂ نفاذِ اسلام اور اس کے محرکات اور طریقِ نفاذ پر نہ صرف مجلسِ شوریٰ کی قرار دادوں میں ، اور امیر جماعت کے بیانوں اور خطوط بنام صدر میں بلکہ ترجمان القرآن کے اوراق میں بھی تمام حقائق لگی لپٹی رکھے بغیر واشگاف طور سے بیان ہوتے رہے ہیں -

۵ — محض "ہدفِ نکتہ چینی" بننا کسی اسلامی نظامِ جماعت کے فیصلہ و عمل کے عدمِ صحت کی دلیل نہیں ہے۔ حکومت کی بین معاملات میں جہاں تک ہم نے تائید کی (اس کے ساتھ ہمارے شدید قسم کے تنقیدی بیانات اور قراردادوں کو سامنے رکھنا چاہیے) اور پھر دوسری جانب اتحاد قائم کرنے کے لیے جو نقشہ ہم نے بنایا، یہ دونوں باتیں ہماری دیانت دارانہ سوچ پر مبنی تھیں۔ یہ تو قاعدہ ہے کہ جب بھی کوئی جماعت سیاست میں رواجِ عام سے ہٹ کر کوئی موقف اختیار کرتی ہے تو اس پر نکتہ چینیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔

۶ — ۷۷ء کی تحریک کے فوائد کو سمیٹ سنبھال کر ساتھ لینا اور انہیں سرمایہ کار بنا لینا اس لیے ممکن نہ ہوا کہ قومی اتحاد کے ٹوٹنے کے علاوہ خود جماعتیں کالعدم قرار پا گئیں اور ہمارے پاس وہ ٹھوس تنظیمی مشینری باقی نہ رہی جس کے ذریعے تحریک ۷۷ء کی فراہم کردہ قوت کو استعمال میں لایا جاتا۔

۷ — انتخابی سیاست پر توجہ دینے کا زمانہ مارشل لاء کے تحت تو بہت ہی مختصر تھا۔ سماجی، تعلیمی اور تبلیغی کام (جنہیں جماعت نے اپنے ٹوٹے پھوٹے نظام کے بعد بھی یکسر ختم نہیں ہونے دیا) اور اس کے اثرات میں جو کمی آئی، شہروں اور قصبوں میں عوامی بنیاد قائم کرنے کے مواقع ہمارے اہداف کے مطابق وسیع نہ ہو سکے (یہ اندازہ صحیح نہیں ہے کہ یہ مواقع یکسر کھو دیئے گئے)، نیز انقلابی نظریے کی دعوت کو سدِ مطلوب تک پھیلانے میں جو کوتاہی ہوئی، ان چیزوں کا بڑا سبب بھی جماعت کی کالعدمیت تھا۔ فکری انتشار کا ماحول، طرح طرح کے ٹکراتے ہوئے رجحانات کے جھگڑوں کا چلنا، مختلف سطحوں اور علاقوں کے کارکنوں کی تعدادِ کثیر کا نت بدلتے بے ہنگم حالات میں ہم آہنگ نہ رہ سکنا، سیاسی لیڈروں کی متفرق بولیاں، مذہبی اکابر کی فکری نیرنگیاں، واعظوں کی شعلہ بیانیاں اور اخبارات کا متضاد قسم کے صد گونہ "سچ" بہت زیادہ بولنا، ان حالات میں اگر خیالات میں الجھاؤ پیدا ہوں اور عمل میں کہیں تذبذب اور کہیں جمود، اور اخلاق میں زوال، تو کیا عجب۔ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ جماعت میں اس طرح کا انتشار و انحطاط کچھ زیادہ واقع نہیں ہوا۔ اور بحالیٔ جماعت کے بعد کمزوریوں پر بہت جلد قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر خدانخواستہ ہم بحالیٔ نظم کے بعد اپنی اصلاح و تعمیر کا کام نہ کر سکے تو پھر کیا کرایا خراب ہو جائے گا۔

۸ — ایسا تو نہیں ہوا کہ اپنے اصول و مقاصد کو درکنار رکھ کر ہم نے محض بیرونی محرکات کے فوری

تقاضوں کے تحت پالیسیوں کی تشکیل کی ہو۔ دو ایک بار خارجی احوال نے ہم سے ذرا جلد جواب مانگا۔ ویسے کون سا زندہ فرد یا زندہ گروہ ہے جو خارجی احوال و ظروف سے قطع نظر کرکے انقلاب یا اصلاح کے راستے پر چلے۔ ہر حال میں ہم نے اپنے نصب العین اور اصولوں کو اپنے سامنے رکھا۔

۹ — میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے کہ ہمارے لوگ اسلامی معاشرے کی تشکیل کے جامع عمل سے غافل ہو جائیں یا اُسے دوسروں کے سامنے واضح کرنے میں کوتاہ ثابت ہوں۔ اُصولی طور پر تبدیلی کے تفصیلی اہداف ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں۔ اور اس لٹریچر میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف عملاً ہم تعمیر معاشرہ کی مساعی سے گزرتے ہوئے اور امکانات اور مزاحمتوں کو سمجھتے ہوئے حال اور مستقبل کی پوری تصویر پیش نظر رکھتے ہیں۔ عملیت (IMPIRICISM) اور تجربیت (PRAGMATISM) کی اصطلاحات کے پیرائے میں آپ نے جس اندیشہ پر توجہ دلائی ہے وہ یہ ہے کہ کہیں ہم اپنے سفینۂ تحریک کو اُصول و مقاصد کے پتوار اور بادبان سے فارغ کرکے ہوائے وقت کے حوالے نہ کر دیں۔ مطمئن رہیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ انشاءاللہ۔

۱۰ — آخر میں میاں طفیل محمد صاحب اور محترم پروفیسر غفور احمد صاحب کے اختلافات کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اختلافات تو اتفاقاً اور غیر متوقع طور پر سامنے آگئے، ورنہ پالیسی طے کرتے ہوئے مجلسِ شوریٰ میں جو بحثیں ہوتی ہیں، اگر کہیں وہ ساری سامنے آجایا کریں تو میرا خیال ہے کہ ہر صبح اور ہر شام اپنے بیگانے انتظار کریں کہ جماعت کی شکست و ریخت ابھی ہونے والی ہے۔ پروفیسر غفور احمد صاحب کے علاوہ بھی بہت سے اختلاف کرنے والے دل کھول کر اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ کسر صرف یہ ہے کہ ان کی بحثیں اور آرا ایوان سے باہر نہیں آتیں۔

۱۱ — متذکرہ مثال کو سامنے رکھ کر آپ نے بطور تحسین فرمایا ہے کہ یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ بلاشبہ مقررہ سطح پر اور مقررہ دائرے میں ہمارا جمہوری کردار بڑے سے بڑے اختلافات کو گوارا کرتا ہے، مگر ہمارا دستور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ درونِ ایوان کی بحثیں اور اختلافی آرا کو باہر لے جایا جائے۔ یہ جماعت کے جمہوری کردار سے تجاوز ہے اور ہماری کمزوری ہے۔ آپ کی تحسین کے شاید پوری طرح ہم مستحق نہ ہوں۔

۱۲ — میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ "مسلم انقلابی" یا "اسلامی انقلابی" کی اصطلاح دین کو جامعیت

اور انبیا ذی شان کے ساتھ پیش کرنے والوں کو کیوں نہیں سجتی ؟ اگر معاملہ محض ذوق کا ہو تو مقام بحث نہیں۔ اور اگر بات استدلال کی ہو تو قطعی دلائل سامنے آنے چاہئیں۔ دلائل صرف آیات ہی سے نہ ملیں گے بلکہ اُن کی ایسی تعبیر و تشریح سے ملیں گے جو اقامت دین کی جمیع سرگرمیوں پر راست آسکے۔

دین کا اولین تقاضا اور دائمی مطالبہ "دعوت" ہی کا ہے۔ لیکن "دعوت بمعنی وعظ" اور "دعوت بمعنی پیغام انقلاب" میں فرق ہے۔ مولینا مودودیؒ نے "رسالہ تجدید و احیائے دین"، "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے"، "اسلام کا نظریہ سیاسی"، "دعوت اسلامی کے تین نکات" "سیاسی کشمکش حصہ سوم" "خلافت و ملوکیت"، "جماعت اسلامی کا لائحہ عمل" وغیرہ میں اپنی دعوت کو انقلابی دعوت کے طور پر پیش کیا۔ ان کا مفہوم یہ تھا کہ مسئلہ صرف انفرادی اصلاح کا نہیں ہے بلکہ افراد کو منظم ہو کر اجتماعی اصلاح و تغیر کے لیے سعی و جہاد کرنی ہے اور تباہ کن سیلاب کا مقابلہ جوابی سیلاب اٹھا کر کرنا ہے۔

انقلاب کا مفہوم لازمی طور پر انتہا پسندانہ تبدیلی (RADICAL CHANGE) نہیں ہے۔ بلکہ انقلابی تبدیلی کے معنی جو ہمارے لٹریچر میں موجود ہیں (بخوف طوالت میں اقتباسات اور حوالے نہیں دے سکتا) وہ یہ ہیں کہ تبدیلی بنیادی قسم کی مطلوب ہے اور جامع اور ہمہ گیر قسم کی مطلوب ہے۔ فرد کے قلب و ضمیر سے آغاز پا کر ایوانِ حکومت اور معاشرے کے ہر شعبے تک اسلام کو قائم ہو جانا چاہیے۔ نقطہ آغاز فرد ہی رہے گا۔ اور بنیادی وسیلہ کار دعوت ہی ہو گا۔

دعوت کے تصور کو وہ کتاب واضح کرتی ہے جس کا نام ہے "دعوتِ اسلامی کے تین نکات" اور تین نکات اجمالاً یہ ہیں:-

I — اپنی پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اور انبیاء علیہم السلام کی پیروی اختیار کرو۔

II — دو رنگی اور منافقت چھوڑ دو اور اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیاں جمع نہ کرو۔

III — خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو دُنیا کی رہنمائی اور فرمانروائی کے منصب سے ہٹا دو، تاکہ زندگی کی گاڑی ٹھیک ٹھیک اللہ کی بندگی کے راستے پر چل سکے۔

لٹریچر کے دوسرے اہم حصوں کو سامنے رکھ کر ذیل کے چوتھے نکتے کا اضافہ کیا جا سکتا ہے:-

IV — تمام گروہ بندیوں، فرقوں اور برادریوں کی عصبیتوں سے بالاتر ہو کر اقامت دین کا

کام کرنے والے نظام جماعت میں اپنی قوتوں کو مجتمع کرو اور پھر اپنی منظم طاقت سے دعوت کو بھی پھیلاؤ۔ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر بھی کرو اور کفر بالطاغوت کا فریضہ بھی ادا کرو۔ تا آنکہ اس جہادِ مسلسل کے نتیجے میں پورے کا پورا دین قائم و نافذ ہو جائے۔

۳ا۔ میرا خیال ہے کہ آج کل شاید بعض اصحاب اسلامی انقلاب کی اصطلاح سے اس لیے بھی بچنا چاہتے ہیں کہ ایران کے اسلامی انقلاب سے اپنے کام کی نوعیت کو ممیز رکھا جائے اور امریکہ و یورپ میں "جارحانہ اسلامیت" کا جو خوف پھیلایا گیا ہے اس کا ازالہ کرنے کے لیے انقلاب کے لفظ کو چھوڑ دیا جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ بار بار بلا وجہ دعوت کی وضاحت میں استعمال ہونے والی اصطلاحات کو بدلنا نہیں چاہیے، البتہ ان کا صحیح مفہوم واضح رکھنا چاہیے۔ مولینا مودودیؒ نے بخوبی تشریح کر دی تھی کہ ہماری مراد مار دھاڑ کا انقلاب نہیں ہے، بلکہ دعوتی، تعلیمی، پُرامن اور آئینی جدوجہد کا دوسرا نام ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اصل نقطۂ آغاز بھی دعوت ہے اور دعوت ہی کو آخر دم تک تمام دوسری سرگرمیوں کے ساتھ جاری رہنا ہے۔ البتہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بالکل آخری مرحلے کی ایک جست تحریک کس انداز سے لگائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کی ایک ہزار ایک شکلیں ہو سکتی ہیں۔

۴ا۔ یہ درست ہے کہ اسلام کی دعوت کے مخاطب ظالم و مظلوم سب ہیں اور وہ دلوں اور دماغوں کو روشن دلائل اور مؤثر کردار کے ساتھ خدا اور اس کے دین کی طرف موڑنا چاہتے ہیں۔ لیکن عملاً تاریخ میں ایسا ہوتا رہا ہے کہ مظلوم اور غریب اور کمزور عناصر جلد اور کثیر تعداد میں لبیک کہتے ہیں جب کہ ظالم افراد اور طبقے مزاحمت کرتے ہیں اور ان کی اکثریت اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے دعوتِ حق کو ملیامیٹ کر دینا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لبیک کہنے والوں، مزاحمت کرنے والوں اور دشمنی پر اتر آنے والوں کے لیے دعوتی رویے الگ الگ ہوتے جاتے ہیں۔

اساسی طور پر دعوتِ اسلامی کی روح اخلاص اور نرم خوئی ہی رہے گی۔ مگر احوال اور مخاطبین کی روش کی وجہ سے اندازِ دعوت میں تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ اگر حضرت موسیٰ و ہارون کو فرعون کے سامنے "قول لین" کہنے کی ہدایت دی گئی تھی تو ساتھ لرزا دینے والی نو ۹ نشانیاں بھی دی گئی تھیں، نیز انہوں نے خدا پرستانہ اساسی دعوت کے ساتھ یہ سیاسی مطالبہ بھی صاف صاف طور پر کر دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کا حق دو۔ اس سے الگ ایک انداز حضرت ابراہیمؑ کا بھی تھا،

جنھوں نے بُتوں کا مُثلہ بھی کیا اور اس سلسلے میں بُت پرستوں کے سوالات کے جواب طنزیہ دیے، نیز نمرودِ سرکش کے سامنے چیلنج کے انداز کی بات کی۔ "حکمت" کا مدعا یہی ہے کہ موقع بہ موقع دعوت کے موثر انداز اختیار کیے جائیں۔ نوبت "جاهد الكفار والمشركين واغلظ عليهم" تک پہنچتی ہے۔

۱۵۔ یہ تصور کہ ایمان والوں کو محض اپنے عقیدے کا دفاع کرنا ہوتا ہے، حقیقت کا کوئی جامع نقشہ پیش نہیں کرتا۔ دعوت ایسے پُر زور استدلال اور اخلاقی وزن کے ساتھ دی جاسکتی ہے کہ مخالفین اپنے نظریات کو جارحانہ طور پر آگے بڑھانے کے بجائے ان کا دفاع کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ تصادم سے بچنے کی ہزار کوشش کیجیے، کسی بھی نئی دعوت کا اٹھنا پہلے فکری، پھر سماجی اور آخر میں سیاسی تصادم پیدا کر دیتا ہے، خصوصاً جب کہ "لا" کے پردے میں کفر بالطاغوت دعوت کے بنیادی کلمے میں شامل ہو۔ عموماً تصادم کا آغاز مخالف قوتوں کی طرف سے جھوٹ، بے جا الزام تراشی اور تشدد کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس طرح دعوتِ حق کے علمبردار مظلومی کے مقام پر آجاتے ہیں اور مظلومی ایسی قوت ہے جو ظلم کی تلوار کو توڑ کے رکھ دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ داعیٔ حق فرد یا جماعت یا تحریک کو ظالم بن کر نہیں، بلکہ مظلومی کی راہ سے کام کرنا ہے۔

۱۶۔ مسئلہ محض کسی شخص کے آسائشیں رکھنے کا اہم نہیں ہے، بلکہ ایک تو اُس کو نوازنے والے نظامِ تقسیمِ دولت کو دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ کہاں تک عادلانہ ہے اور دوسرے یہ ملحوظ رکھنا پڑتا ہے کہ آسائشیں رکھنے والے لوگوں ہی کی اکثریت یا تو مزاحم بنتی ہے، یا اختلاف کرتی ہے، یا بے عملی کا شکار رہتی ہے۔ نیز ایک ایک شخص کی آسائشیں کتنے ہی دوسرے بے شمار انسانوں اور ان کے بچوں کے لیے وجہِ اذیت اور باعثِ اضطراب بنتی ہیں۔ لہٰذا دعوتِ حق فقط آسائشیں رکھنے کی بنیاد پر کسی شخص کی مخالفت نہیں کرتی مگر یہ بھی مسلمہ ہے کہ خدا کی راہ میں صاحبِ دعوت یا داعیِ انقلاب بننے کے ساتھ دنیوی لذات اور آسائشوں کی کثرت چل نہیں سکتی۔ یا تو دعوت کے لیے انفاق کے بڑھنے کے ساتھ لذات اور آسائشیں گھٹیں گی یا پھر خود دعوت کمزور ہونا شروع ہو جائے گی۔ اسلام کا کام کرنے کے لیے ایک گونہ فقر کا ہونا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ دولت کے ہوتے ہوئے بھی فقر غالب ہو سکتا ہے مگر ایسا مرتبہ پانے والے کم ہی دیکھنے میں آئیں گے۔

۱۷۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ اسلامی تحریک کے لوگ معاشرے کی اساسی تبدیلی کا اسلامی تعلیمات پر مبنی تصور موزوں انداز میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی طرح یہ بھی بہت زیادہ ممکن ہے کہ خالص دعوتِ اسلامی کو پیش کرنے والے بھی اس کے صحیح مفہوم اور تقاضوں اور وسعتوں کے ساتھ اور اُس کی مطلوبہ تبدیلیوں اور اس سے پیدا ہونے والے اصولی اور فکری تصادموں کے ساتھ سامنے نہ لا سکیں۔ نتیجہ اس کا یہی ہوگا کہ دعوتِ اسلامی سے وہ انسان مطلوب اور اس کے رویے وجود میں نہ آسکیں گے، جن کا طلب گار دین ہے۔ تارک الدنیا درویش، خانقاہی صوفی اور انفرادی مسلمانیت کے نمونے اسی وجہ سے وجود میں آتے رہے۔ انقلابی دعوت اگر نتائج کے لحاظ سے بانجھ اور بے نتیجہ نکل سکتی ہے تو خالی دعوت بھی اس معنی میں بانجھ پن دکھا سکتی ہے کہ سینکڑوں نیک آدمیوں کے موجود ہوتے ہوئے بھی بدی کا تخت اُن کے کاندھوں پہ لٹکا رہے اور ظلم و خیانت کا طوفان چاروں طرف موجزن رہے۔

۱۸۔ "بُرائیوں سے روکنے" کا جو حوالہ آپ نے آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۰۴ سے دیا ہے، اس کے متعلق کیا یہ فرمائیں گے کہ روکنے سے کیا کیا شکلیں مراد ہیں؟ نیز کیا اس کی کسی ادنیٰ شکل پر سالہا سال کے لیے قانع ہو کر بیٹھ رہنا اس جذبے میں زندگی باقی رہنے دے گا۔ دُنیا میں جب بھی کسی مروّج چیز کو روکنے کا کام شروع کیا جاتا ہے، معاشرے میں مدّوجزر پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر دعوت کا واعظانہ تصوّر ختم ہو جاتا ہے۔

۱۹۔ ایک قوت ہے فوجی قوت، اس کا استعمال تو بہت ہی خاص قسم کے حالات کے لیے مخصوص ہے۔ دوسری قوت رائے عام کی سیاسی قوت ہوتی ہے۔ آپ کسی بھی حکومت میں رہتے ہوئے اس قوت سے کام لے کر مخالف کو زچ کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہمارے معاشروں میں لادینیت اور سیکولرازم کا طوفان جارحانہ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے، عیاشی و فحاشی کا ریلا ہے، شریعت میں ترامیم کی جارہی ہیں۔ دینی اصطلاحات کو بدلا جارہا ہے۔ پردے کو غارت کیا جارہا ہے۔ کیا اس حالت میں یہ بات "دعوت" کے خلاف ہوگی کہ اخبارات اور اسٹیج کے ذریعے اس طوفان کے خلاف آواز اُٹھائی جائے، جلسے کیے جائیں، ممکن ہو تو پُرامن خاموش مظاہرے کیے جائیں، ارکانِ پارلیمان سے وزیروں کے وفود ملیں، محضرنامے بھجوائے جائیں۔ مجھے کوئی کھوٹ نظر نہیں آتی

۲۰ ـــ باطنی آمادگی (CONVICTION) ضروری ہے ۔ مگر اس آمادگی کے حصول کے بعد اگر ایک شخص یا گروہ اپنی قوتوں کو اسلامی انقلاب انگیزی کی مہم میں لگائے تو کونسا گناہ اس سے سرزد ہوا "لیبل" کا مسئلہ وہاں ہوتا ہے جہاں حقیقت تو کچھ اور رہا اور ظاہر کچھ اور کرنا ہو ۔ ہم تو فی الحقیقت تصورِ اسلام کے ساتھ انقلابیت کو ضروری سمجھتے ہیں ۔ لیبل ازم کا ایسا ہی اطلاق غیر انقلابی دعوت پر بھی ہوسکتا ہے ۔

۲۱ ـــ عملیت اور تجربیت اور اصلاح کاری کی جو اصطلاحات جناب انصاری و جناب فتحی نے استعمال کی ہیں اُن کی جبلّت مادہ پرستانہ ہے ۔ یہ اصطلاحات ایک جامع فلسفے کے معروف سوچ میں ان کا جوڑ اسلام سے لگانا مناسب نہیں ۔ ہماری اپنی اصطلاحات ہیں اور ہمیں انہی میں بات کرنی چاہیئے ۔

۲۲ ـــ یہ بڑی قابلِ قدر بات ہے کہ برادر مکرّم فتحی عثمان صاحب نے عربیبا کے صفحات کو مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کے لیے مشترک پلیٹ فارم قرار دے کر یہ دعوت دی ہے کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے بھی احباب چاہیں تو خیالات کا اظہار کرسکتے ہیں ۔

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں ۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں ۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے ۔

(ادارہ)